ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

Vol. 5 No.3 2021

آوازِ دوست کا تجزیاتی مطالعہ

AN ANALYTICAL STUDY OF "AAWAZ E DOST"

صدیق اقبال

پی ایچ ڈی اسکالر ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

افشاں جبین

لیکچرار اردو، یونیورسٹی آف ملاکنڈ

محمد لیاقت

پی ایچ ڈی اسکالر ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

Abstract:

Mukhtar Masood has been a well-known reference to the services of knowledge and literature. There are diverse literary colors in his prose. In the world of knowledge and literature, if their style and analysis are examined, then their efforts are inexhaustible. He has a unique style and knows how to conquer hearts due to this unique and charming style, due to which he keeps his readers in his circle all the time. He knows the art of writing fluently in a simple way. In his writings historical phrases are used as examples. In his works, every subject is divided into one unit, which has the status of a full-fledged training institution. His first book ''Awaz e Dost'' has two main topics: ''Minar-e-Pakistan'' and ''Qehtur Rejal''. He has toured buildings all over the world on the subject of Minar-e-Pakistan, while sketches of famous personalities have been drawn in another subject Qehtur Rejal. In this article, an analytical study of Mukhtar Masood's first book "Awaaz Dost" has been discussed.

Key Words: *Mukhtar Masood, Awaz e Dost, Autograph album, Pencil Sketches, Quid e Azam, Allama Iqbal, Aligarh*

آواز دوست ایک فکری کاوش ہے۔اس کی بنیادی اکائی مختصراً یہ ہے کہ ایک قوم کی حیثیت سے ہم کون اور کیوں ہیں؟ دو صد صفحات پہ مشتمل اس کتاب میں مختار مسعود وہ کچھ کہہ گئے جو کئی لوگ بڑی بڑی کتابوں میں بھی بیان کرنے سے قاصر رہے۔اس کا چھپنا محض ایک اتفاق نہیں بلکہ اس کا رشتہ زندہ اصولوں سے مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔اس کے پیچھے ایک قافلہ رواں تھا۔ملت کے گمشدہ آوازوں کا،اردو ادب کے بہترین متحرک ورثے کا،اونچے اونچے خیالوں کا،پاکیزہ اور نفیس جذبوں کا، قومی اُمنگوں کا اور مصنف کی ذاتی ریاضت کا۔یہ کتاب مختار مسعود کی پہلی تصنیف ہے جو کہ جنوری 19۷۳ء کو شائع ہوئی جس میں دو مضامین "مینارِ پاکستان" اور "قحط الرجال" شامل ہیں۔ اس بے مثال تصنیف کی اہمیت کا اندازہ کرنل محمد خان کے ان الفاظ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

> "آوازِ دوست بنیادی طور پر ایک خالص علمی بلکہ نیم آسمانی سی کتاب معلوم ہوتی ہے اور موضوع کی طہارت کی وجہ سے ہم اسے بے وضو چھو بھی نہیں سکتے۔"(۱)

"آوازِ دوست" بیک وقت ایک خیال انگیز علمی کاوش بھی ہے اور ایک نہایت دلکش علمی کارنامہ بھی۔اور یہ اعجاز ہے ان کی اسلوبِ نگارش میں شکوہ اور شگفتگی کے فنکارانہ امتزاج کا۔ان کا شکوہ بھی اگرچہ ایک طرح کی ریشمی ملائمت کا بنا ہوا ہے جو خوب صورت چیزوں کو خوب صورت پیرہن عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ان کی اندازِ تحریر کی سب سے نمایاں خوبی شگفتگی کی وہ رواں دواں لہر ہے جس کی بدولت وہ حکیمانہ نسخوں کو ادیبانہ زبان میں اور مرنے کی روداد کو زندگی کے لہجے میں بیان کر گئے ہیں۔یوں تو یہ کتاب دو

حصوں میں منقسم ہے، لیکن اس کے اندر ہر ایک موضوع تقسیم در تقسیم ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کتاب خونِ دل سے لکھی گئی ہے۔ وہ خون جو سفید نہیں ہوا اور جس میں 1947ء کی گرمی اور حرارت بھی شامل ہے اور علی گڑھ کی جواں فکر بھی۔ اس کتاب میں بات پاکستان سے شروع ہوتی ہے اور پاکستان پر ختم کی گئی ہے۔ ظاہری بات ہے جس گھر کی تعمیر میں خود گھر والوں کا خون شامل ہو وہ اس گھر کو کیسے بھول سکتا ہے؟

آوازِ دوست کا بنیادی موضوع پاکستان، نظریۂ پاکستان، تاریخ پاکستان، تحریک پاکستان، قیامِ پاکستان اور ناگزیر تاریخی تقاضوں کی کار فرمائیوں سے منکر لوگوں کے ہاتھوں پاکستان کی شکست و ریخت ہے۔ یہ ایک مینار کی کہانی نہیں اور یہ صرف سوانح عمری ہے اُن مشاہیر کی جن کے ناموں اور کارناموں کا اس میں ذکر آیا ہے۔ یہ ایک متحدہ اور اٹوٹ مسلم قومیت کے خواب اور اس کی تعبیر کی بہترین داستان ہے۔ اس کتاب کا پہلا مضمون "مینارِ پاکستان" ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے مینار پاکستان کو بنانے کا مفصل ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ کس طرح اس عظیم الشان عمارت کا نقشہ بنایا گیا اور کس محنت اور سوچ کے تحت اس کا وجود عمل میں آیا۔ اس مضمون میں انھوں نے بنیاد سے لے کر اختتام تک کا ذکر بہترین پیرائے میں کیا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس عمارت کے توسط سے انھوں نے دنیا میں موجود بڑی بڑی عمارتوں کو موضوع بنایا ہے۔ جس طرح اوپر ذکر ہوا ہے کہ اُن کی فنکاری یہ ہے کہ وہ قاری کی توجہ کسی صورت دوسری طرف بھٹکنے نہیں دیتا اور اپنے ساتھ ساتھ قاری کو بھی پوری دنیا کا سیر کرا دیتے ہیں۔ وہ بڑی مہارت کے ساتھ ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور یہ طریقہ وہ کتاب کے اختتام تک لے جاتے ہیں۔ یہاں پر بھی اس قسم کی تکنیک سے کام لیا گیا ہے۔ مینار پاکستان کا قصہ ابھی شروع ہی ہوا ہے کہ وہ اہرام مصر کا تذکرہ شروع کر دیتے ہیں۔

مینار کی بنیادوں میں ریت اور بجری سے لے کر مختلف ڈیزائنوں، نقشوں، کاریگروں اور انجینئروں کی میٹنگ تک اس مینار کے جتنے مراحل تھے اس کی نگرانی مختار مسعود نے خود کی ہے۔ وہ اس عمارت سے متعلق معمولی سے معمولی امر کے لیے مختلف کمیٹیاں تشکیل دیتے۔ کئی کئی روز تک اس عمارت کی ڈیزائن پر غور فکر کیا گیا۔ دنیا کی عمارتوں کے نقشے دیکھے بھالے جاتے۔ مختلف عمارات کے ڈیزائنوں کو موقع و محل کے ساتھ دیکھا جاتا۔ ماحول اور منظر کو کئی بار دیکھا جاتا کہ کہیں کسی کوتاہی کا مظاہرہ نہ ہو۔ تقابل اور جائزوں کے لیے قابل انجینئرز کو بلایا جاتا۔ دیگر عمارتوں کے نقشے میز پر پھیلائے جاتے۔ روز اسی طرح نشت و برخاست جاری رہتی۔ طویل غور و غوض کے بعد جب ڈیزائن طے ہوا تو پھر نام کی باری آئی۔ اس حوالے سے بھی کئی میٹنگز ہوتے رہے۔ روزنہ کی بنیاد پر مختلف ناموں پر گفتگو ہوتی اور نشست برخاست کر دی جاتی۔ اس حوالے سے مختار مسعود لکھتے ہیں:

> "مینارِ قرارداد پاکستان کی مجلسِ تعمیر کی نشست تھی۔ میز کے ارد گرد تمام اراکین جمع تھے۔ میں آج ان میں پہلی بار شامل ہوا تھا۔ کارروائی کی پہلی شق غور کے لیے پیش ہوئی۔ میرا ذہن اس وقت برناڈشا کے اس مقولے پر غور کرنے میں مصروف تھا کہ وہ مقام جہاں خواہش قلبی اور فرائضِ منصبی کے کے حدیں مل جائیں اسے خوش بختی کہتے ہیں۔ میں بہ لحاظِ عہدہ اس مجلس کی صدارت کر رہا ہوں مگر عہدے کو ایک عہدِ وفا کا لحاظ بھی تو لازم ہے۔" (۲)

مینار پاکستان کی عمارت کی پہلی مجلس اس کے نام کی مناسبت سے تھی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے مختار مسعود نے لغات کا ڈھیر لگایا۔ مختلف نام زیرِ غور آئے، لیکن مختار مسعود کا ذہنِ رسا "مینارِ پاکستان" پر رک گیا۔ نام کے مناسبت سے تمام مراحل بالآخر مکمل ہو گئے۔ کام شروع ہوا۔ یہاں سے مینار کے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے مختار مسعود دنیا کے مشہور و معروف عمارتوں کا ذکر خود بھی کرتے ہیں اور اپنے قاری کو بھی ساتھ ساتھ لے جاتے ہیں۔

مینار پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے مختار مسعود نے دنیا کے جن عظیم عمارتوں کا ذکر کیا ہے ان میں احرامِ مصر، دیوارِ چین، ٹاور آف لندن، مسجد بنو امیہ، مینارِ قیروان، مینار جر قورغان، سمرقند میں بی بی خانم کا مینار، خیوہ کے مینار، انجیل کا مینار، قطب مینار، منوّرہ کا روشن مینار، معصوم شاہ کا مینار، لائلپور چوک کا مینار، شیخوپورہ کا مینار اور گڑھی شاہو کا مینار شامل ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

مینار پاکستان کے اس طویل مضمون میں مذکورہ عمارتوں کا پورا پورا حال ذکر ہے۔ یہ وہ عمارتیں ہیں جن کا کسی نہ کسی صورت میں مینار پاکستان کے ساتھ موازنہ اور مشابہت ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی وہ مینار تھے جن کے ڈیزائن اور نمونے دیکھ کر مینار پاکستان کی عمارت وجود میں آئی۔ عمارات کا سیر کرتے کرتے وہ علی گڑھ اور سرسید کی طرف نکلے ہیں۔ یہاں پر وہ اپنے مختلف سنگِ میل عبور کرنے کا بحث شروع کرتے ہیں۔ وہ سرسید کے یونین ہال میں لگے ہوئی تصویر کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ”سرسید کی ایک رعب دار روغنی تصویر یونین ہال کی دیواروں پر لگی ہوئی بہت سی تصویروں کے وسط میں اویزاں تھی۔ اس کے دائیں اور بائیں قائد اعظم اور اقبال کی تصویریں تھیں۔ اب ذہن میں جو شکلیں اُبھرتی ہیں ان کا مرکز بھی یہی تین صورتیں ہیں۔“(۳)

یہاں پر وہ تھیوڈور ماریسن کے تصورات اور ہندوستان کے مشترکہ تصورِ قوم کو واضح کرتے ہیں۔ شملہ وفد اور لارڈ منٹو کے تذکرے کرتے ہیں۔ ولیم آرچی بالڈ اور مولانا آزاد کی خدمات پر ایک مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہاں ایک دفعہ پھر وہ اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں اور مینار پاکستان کی مخالفت جس طرح کی گئی وہ ساری صورتِ حال بتا دیتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ یوں رقم طراز ہیں:

> ”قراردادِ لاہور منظور ہوئی تو اس کی مخالفت شروع کی گئی۔ مخالفوں نے ہی اس کا نام قراردادِ پاکستان رکھا اور خود نامزد کرنے کے باوجود یہ کہنا شروع کیا کہ پاکستان کا مطلب ہی اس کا نام قرارداد پاکستان رکھا۔“(۴)

مختار مسعود نے قرارداد لاہور کی مخالفت کرنے والوں پر طویل گفتگو کی ہے۔ اس بحث میں مینار پاکستان کے سیڑھیوں پر چڑھتے ہیں اور دنیا کی عمارات کی طرف نکلتے ہیں۔ اپنی مدلل گفتگو میں وہ جگہ جگہ اشعار سے بھی کام لیتے ہیں۔ ان کے یہ اشعار موقع و محل کے مناسب سے نہایت درست معلوم ہوتے ہیں۔ کتاب کی شروع سے آخر تک مختلف اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ مینار پاکستان کی سیڑھیوں پر چڑھتے چڑھتے مختار مسعود نے تاریخ کے کئی اوراق سے پردہ ہٹایا۔ کئی عمارتوں کے اندر جانکلا۔ کئی شخصیات پر اپنے تاثرات قلم بند کیے۔ اب جب ساری سیڑھیاں ختم ہوئیں اور وہ آخری منزل پر پہنچا تو وہاں سے آس پاس کا نظارہ کیا۔ مینار پاکستان کے طویل مضمون کے بعد قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے ساری دنیا کی عمارات کا سیر خود ہی کیا ہو۔ اس مضمون کے حوالے سے سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں:

> ”علمی و ادبی حلقوں میں آوازِ دوست کے مصنف کا آوازہ چند برس پیشتر مینار پاکستان کے مضمون کی اشاعت پر بلند ہوا تھا۔ اس سے پہلے ان کی تقریروں کا چرچا تھا۔ مگر یہ چرچا مخصوص ادبی و تہذیبی محفلوں تک ہی محدود تھا۔ مینارِ پاکستان پر ان کا مضمون شائع ہوا تو سچی بات یہ ہے کہ عنوان دیکھ کر ماتھا کچھ تھوڑا سا ٹھنکا بھی تھا کہ کہیں تعمیراتی کمیٹی کے سربراہ کی رپورٹ ہی نہ ہو اور سرکاری رپورٹوں میں عموماً مواد کم اور ملبہ زیادہ ہوتا ہے۔“(5)

یہاں پر عمارات کے تذکرے اور خاص کر مینار پاکستان کے ذکر کا اختتام ہوتا ہے۔ اس بحث کے بعد اس کتاب کا دوسرا مضمون ”قحط الرجال“ شروع ہو جاتا ہے۔ قحط الرجال میں انھوں نے چند ممتاز و نامور شخصیتوں کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ شخصیتیں مختلف ہیں مگر کہانی مربوط ہے۔ شخصیتوں کی حکایت ان کے آٹو گراف البم کے ساتھ ساتھ گھومتی ہے۔ قحط الرجال کا آغاز مختار مسعود کے اس شہرہ آفاق جملے سے ہوا جو بعد میں ان کی پہچان بنا:

> ”قحط میں موت ارزاں ہوتی ہے اور قحط الرجال میں زندگی۔ مرگِ انبوہ کا جشن ہو تو قحط، حیاتِ بے مصرف کا ماتم ہو تو قحط الرجال۔ ایک عالم موت کی ناحق زحمت کا، دوسرا زندگی کی ناحق تہمت کا۔“(۶)

اس مضمون میں انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں خاکہ نگاری کی ہے اور شائد خاکہ نگاری کو اوجِ کمال تک پہنچایا ہے۔ وہ اس طرح خاکہ نگاری کر ڈالی اور اتنی منظم انداز میں کی کہ معلوم ہی نہیں پڑتا کہ تاریخ ہے، نثر ہے، تجزیہ ہے یا شخصیات کا تذکرہ۔ مختار مسعود نے ان شخصیات کا ذکر کیا جن سے انھیں آٹو گراف لینے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ داستان مشہور چینی عالم محمد ابراہیم شاکیو چن سے شروع ہوتی ہوئی سروجنی نائیڈو کے دستخط کی داستان تک پہنچی ہے۔

اس اٹوگراف البم کو انھوں نے ورما فوٹو گرافر سے خریدا۔ اس کتاب کو خریدنے کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ ورما فوٹو گرافر کے ہاں بہت سے البم پڑے تھے مجھے نیلے رنگ کی یہ چھوٹی سی اٹوگراف البم پسند آئی جس میں مختلف رنگوں کے صفحات لگے ہوئے تھے اور جلد پر البم کا لفظ سنہرا چھپا ہوا تھا۔ اس کی قیمت صرف چھے آنے تھے۔ اس وقت بھی مجھے یہ قیمت زیادہ لگی اور میں آج بھی اس کو بیش قیمت سمجھتا ہوں۔

اٹوگراف البم میں شخصیات کی فہرست سے ان کی ذہنی ترجیحات کی نشان دہی یقیناً ہوتی ہے۔ دو چار کے سوا باقی سب اصحاب برصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے ستون تھے۔ حق گوئی اور بے باکی ان کا شیوہ تھا، خدا اور خدا کے رسولؐ کے فدائی۔ اس اٹوگراف البم پر سب سے پہلے دستخط ان کے والد کے چینی دوست محمد ابراہیم شاہ کیو چن کے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس دستخط کے بعد میں سوچ میں پڑھ گیا کہ اب کس کے دستخط حاصل کرلوں؟ بالآخر اس کے والد نے ان کو بتایا کہ جاؤ اور نگہِ انتخاب کو کام میں لاؤ۔ بڑے آدمی زندگی میں کم اور کتابوں میں زیادہ ملیں گے۔ والد صاحب کے اس نصیحت کے بعد وہ مختلف ادبی و غیر ادبی لوگوں سے ملے اور ان کے دستخط حاصل کر لیے۔

یہاں پر انھوں نے بہادر بچوں کی کہانیاں بیان کیئں۔ کئی قرآنی آیات کے حوالے دے کر مختلف موضوعات زیر بحث لائے۔ مختار مسعود کہتے ہیں کہ اٹوگراف البم لے کر میں ایک طویل عرصے تک ایک شخص کے تلاش میں رہا۔ بالآخر وہ شخص مل گیا، لیکن میں جب اس سے ملا تو وہ اپنی جائیداد اور گاڑیوں کی فہرست سنانے لگا۔ میں نے اٹو گراف البم کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کر وہ خود بخود جیب سے باہر آجائے اور وہ اس پر دستخط کر دیں۔

اٹوگراف البم میں دوسرے نمبر پر جس شخصیت کے دستخط تھے اس کا نام بہادر یار جنگ تھا۔ مصنف نے بہادر یار جنگ کا خوب صورت خاکہ کھینچا ہے۔ انھوں بہادر یار جنگ کی تقریر کا تذکرہ بھی کیا ہے جو انھوں نے سیرت کا ہفتہ منانے کے دوران کی تھی۔ مختار مسعود نے بہادر یار جنگ پر تفصیل کے ساتھ لکھا اور اپنے اٹوگراف البم میں اس کے دستخط حاصل کر لیے۔ بہادر یار جنگ کا حلیہ بیان کرتے ہوئے مختار مسعود لکھے ہیں:

> "ہلکے سفید بال، نیلی آنکھیں اور چھوٹی سی دھنسی ہوئی ٹھوڑی، اس کے ارد گرد خود اعتمادی اور خوش گواری کا ایک ایسا ہالہ تھا جو کامیاب زندگی اور مطمئن دل کا عطیہ ہوتا ہے۔"(۷)

بہادر یار جنگ کے بعد مختار مسعود نے ای ایم فاسٹر کا خاکہ لکھا۔ ان کے اٹوگراف البم کے دسویں صفحہ پر فاسٹر کے دستخط موجود ہیں۔ اس بارے میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

> "اٹوگراف البم کے دسویں صفحہ پر ای ایم فاسٹر کے دستخط ہیں۔ خط واجبی سا ہے، لکھائی گنجلک، سارے الفاظ ایک دوسرے میں پیوستہ ہیں۔ پہلے تین لفظ آخری چھے لفظوں سے زیادہ جگہ گھیرے ہوئے ہیں۔ دستخط کے نشست بھی درست نہیں۔ یہ دستخط میں نے یونین ہال میں حاصل کیے تھے۔"(۸)

ای ایم فاسٹر کے ناول نگاری پر مختار مسعود نے تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ ای ایم فاسٹر کے بعد جس شخص کا خاکہ اٹوگراف البم میں شامل کیا گیا اس کا نام ملا واحدی ہے۔ مختار مسعود نے ملا واحدی کے کارناموں اور خدمات پر بہترین پیرایے میں گفتگو کی ہے۔ انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں واحدی کا خاکہ کھینچا ہے۔ واحدی صاحب کے عادات و اطوار کے علاوہ مصنف نے اُن کی تحریر پر بھی بحث کی ہے۔ واحدی کا وضع قطع انھوں نے کچھ یوں لکھا ہے:

> "مفلوج جسم میں ایک صحت مند ذہن، ضعیفی میں جواں ہمتی، بستر علالت پر ایک سرگرم عمل زندگی۔ مصنف کہتے ہیں کہ واحدی صاحب کو جب میں نے اٹوگراف البم دستخط کے لیے پیش کی تو انہوں نے دستخط بھی کیے اور نصیحت بھی۔"(9)

ملا واحدی کے مفصل خاکے کے بعد مختار مسعود نے حسرت خاکہ لکھا ہے۔ انھوں نے حسرت کی زندگی کچھ واقعات جزیات کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ انھوں نے اس خاکے میں حسرت کی زندگی کے علاوہ اس کی شاعری پر بھی طویل گفتگو کی ہے۔ حسرت کی شاعری کی خوبیوں کو انھوں نے تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں۔ اس مضمون میں مختار

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

مسعود نے ان کی ایک غزل اور چند اشعار بھی شامل کیے ہیں۔ حسرت کی شاعری کے علاوہ انھوں نے ان کے قید و بند کی داستان بھی رقم کی ہے۔ حسرت کے خاکے کے حوالے سے مختیار مسعود لکھتے ہیں:

> ''بھرے بھرے بھدے ہاتھ جن میں کل رات ایک باریک نب والا قلم پکڑ کر اس باغی صفت، صوفی منش، غریب شہر اور رئیس غزل نے میری اٹوگراف البم میں لکھا تھا، فقیر حسرت موہانی ۲ دسمبر ۱۹۴۳ء۔'' (10)

مصنف اُن کے دستخط کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ فقیر کے نقطے نہیں نہ سہی، وہ شخص نکتہ سنج تو تھا۔ لکیر سید نہیں نہ سہی، وہ خود تو ساری عمر صراط مستقیم پر چلتا رہا۔ دستخط بد خط سہی، وہ شاعر تو خوش نوا تھا۔ مصنف نے حسرت کے جیل میں چکی پیسنے کے حالات بھی بیان کے ہیں۔ ظفر علی خان بھی ایک عرصے تک گرفتار بلا رہے۔ اور یہی دونوں کی زندگیوں میں مشترک قدریں تھیں۔ حسرت کے بعد جس شخص کے دستخط حاصل کر لیے گیے اور جس کا خاکہ لکھا گیا اس کا نام ظفر علی خان ہے۔ مصنف نے ظفر علی خان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو وا کیا ہے۔ ظفر علی خان کی شاعری ہو یا ان کی نجی زندگی، اُن کے عادات واطور ہوں یا قید و بند کی صعوبتیں۔ تمام پہلوؤں پر مختار مسعود نے قلم اُٹھایا۔ مختار مسعود نے حسرت کی طرح ظفر علی خان کی شاعری کے مختلف خوبیوں کو اُجاگر کیا اور اس کی غزلیں یہاں پیش کیں۔ مصنف نے ظفر علی خان کی شاعری کے کئی رخ بیان کیے ہیں۔ ظفر علی خان کے حمد اور نعت پر بھی بحث کی گئی ہے اور زمیندار اخبار کے ساتھ وابستگی بھی موضوع میں شامل ہے۔ مولانا ظفر علی کو دیکھنے کا ذکر کرتے ہوئے مختار مسعود یوں رقم طراز ہے:

> ''میں نے جب اُنہیں دیکھا تو وہ ایک تحریک کے معمار کی حیثیت یونین ہال میں بیٹھے تھے، ان کی ٹوپی کا پھندنا جھٹکے کے ساتھ ہلتا تھا۔ ہاتھ بھی ہر وقت حرکت میں تھے اور پہلو بھی بار بار بدلتے تھے۔''(11)

مختار مسعود اُن کے دستخط لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے اٹوگراف البم کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ظفر علی خان نے البم مجھے لوٹانے کے بجائے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک اور شخص کے سامنے کر دیا مجھے ایسا لگا کہ ابھی اس البم کا دھر رگڑ ہو جائے گا۔ شخصیتوں کے باب میں بھی اگرچہ براہ راست روئے سخن تو چند اکابر ہی سے رکھا ہے مگر وقفہ بہ وقفہ غیر حاضر مشاہیر بھی تشریف لاتے رہے ہیں۔ بقول سید ضمیر جعفری:

> ''یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ مشہور و معروف لوگ، اہل کمال اور اہل جمال یونہی چھڑی گھماتے ہوئے ٹہلتے ٹہلتے اتفاقاً ادھر آنکلے ہیں۔ جو کوئی آتا ہے تو اس کے ہاتھ میں دانش و حکمت کی لالٹین ہوتی ہے یا حسن و خوبی کا گلدستہ اور وہ جلد جلد کچھ روشنی دکھا کر یا چند پھول دے کر تاریخ کے صفحات میں لوٹ جاتا ہے۔ ''(12)

شاہ جی بھی اٹوگراف البم میں دستخط کرنے والوں میں سے تھے۔ اُن کے دستخط کی باری ظفر علی خان کے بعد آتی ہے۔ مختار مسعود نے دوسری شخصیات کی طرح اُن کے حالات زندگی رقم کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ شاہ جی کا پورا نام عطا اللہ شاہ بخاری تھا۔ مصنف کہتے ہیں کہ میں نے جب اٹوگراف البم اُن کے سامنے رکھ دی تو انھوں نے پہلے تین اشعار رقم کیے اور پھر نیچے ایک طویل کشش کے ساتھ سید لکھا اور سید کے اوپر بخاری لکھ کر دستخط مکمل کر دیے۔ مصنف نے نوابوں میں جس شخص کے دستخط حاصل کیے اس کا نام نواب بھوپال سر حمید اللہ خان ہے۔ اس کے وضع قطع کے حوالے سے مختار مسعود لکھتے ہیں:

> ''نواب بھوپال نے سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ ایک عام آدمی کی طرح محفل میں شامل تھے۔ لمحے بھر کے لیے بھی یہ احساس نہ ہوا کہ یہ اس قبیلے کے رکن ہیں جن کی آراستہ و پیراستہ تصویریں درجنوں کے حساب سے ہر سال سٹیٹسمن ایئر بک میں چھپا کرتی ہیں۔''(۱۳)

مختار مسعود کی اٹوگراف البم میں راجہ آف محمود آباد کے دستخط بھی ہیں۔ اس کا تعلق اودھ کی تعلق داری اور لکھنو کے امام باڑے سے تھا۔ انھوں نے راجہ صاحب کی زندگی کے دلچسپ پہلوؤں کو بڑی فنکاری سے بیان کیے ہیں۔ ہندوستان میں اُن کی زندگی کے حالات وواقعات ہوں یا پاکستان آنے کے بعد والی زندگی۔ مختار مسعود نے سب

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

اپنے قلم کی نوک پر رکھ لی ہے۔ مصنف نے اس سے کراچی میں ملاقات کی۔ ملاقات کی اس داستان کو انھوں نے اپنی تحریر کا حصہ بنایا۔ راجہ صاحب کی قائد اعظم سے ملاقاتوں کے تذکرے بھی اس خاکے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان سے اٹوگراف البم پر دستخط لینے کا ذکر مختار مسعود نے یوں کی ہے:

> ”میں نے دراز کھولا اور اٹوگراف البم نکالی، آج سے ستائیس برس سے پہلے راجہ صاحب نے دسمبر 1943ء میں اس البم پر دستخط کرتے ہوئے راجہ صاحب نے دو اشعار بھی لکھ دیے۔“(۱۴)

مختار مسعود لکھتے ہیں کہ اب میرے اٹوگراف البم میں چار ورق باقی ہیں۔ چونتیس برس سے استعمال ہونے والی اس البم میں مختلف شخصیات کے دستخط شامل ہیں۔ انھوں نے بعض اشخاص کے خاکے لکھے ہیں، لیکن ان کے دستخط نہیں لیے۔ دستخط نہ لینے والوں میں آزاد کا نام بھی شامل ہے۔ گو کہ مختار مسعود اُن کے نثر کے معترف ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ میں آزاد کی نثر کی معترف ہوں۔ یہاں پر وہ ملکہ الزبتھ کی کراچی آمد اور پاکستان کے دورے پر بھی اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے ابوالکلام کے خاکے میں اپنے چینی دوروں اور وہاں کے حالات و واقعات پر بھی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرا البم چین سے بغیر دستخط کے آیا۔ انھوں نے اپنے البم میں صرف اُن لوگوں کو جگہ دی ہے جو ملک و قوم کے وفادار تھے۔ وہ بڑے ناموں اور مشہور شخصیات کی دولت اور نام کے پرواہ دار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے اہم شخصیات کے دستخط انھوں نے جان بوجھ کر حاصل نہیں کیے۔ اس فہرست میں مولانا ابوالکلام آزاد، چینی اور برطانوی شخصیات قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا آزاد کے مختصر خاکے کے بعد انھوں نے چین کے حالات، دورے اور ملکہ الزبتھ کے ساتھ ساتھ مارشل ٹیٹو پر طویل بحث کی ہے۔ اس بحث کے بعد انھوں نے اوتھانٹ کو اپنے بحث میں شامل کیا ہے اور اس کے بعد وہ اپنے ٹوکیو کے دوران پیش آنے والے واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔ یہاں پر انھوں نے ایک لڑکی کا قصہ بھی بیان کیا ہے جس کے اٹوگراف البم میں دستخط تو بہت تھے، لیکن وہ لڑکی حیا و عزت سے مبرا تھی۔ لڑکی کے قصے کے بعد انھوں نے چند اسلامی قصوں کا ذکر کیا ہے۔ ان قصوں کے بعد انھوں سروجنی نائیڈو کا خاکہ لکھا ہے۔ سروجنی کا سراپا انھوں نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

> ”بوٹا قد، تنگ دہن، جوڑے میں جڑاؤ پھول ہیں اور گلے میں موتیوں کا ہار، بائیں ہاتھ کے پہلی انگلی میں بڑی سی انگوٹھی ہے۔“(۱۵)

مختار مسعود نے سروجنی نائیڈو کے خدمات اور اس کی زندگی کے اہم واقعات کو بیان کیا ہے۔ ان کی زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ مصنف نے اُن کے علی گڑھ کے دوروں کو خاص اہمیت دی ہے اور اُن کے تمام دوروں اور تقاریر پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اٹوگراف البم میں سروجنی کے دستخط بھی موجود ہیں۔ سروجنی کے بعد خاکوں کے ذیل میں پروفیسر ہادی حسن کا ذکر آتا ہے۔ موصوف مصنف کے ہم جماعت تھے اس لیے ان کو پروفیسر صاحب سے بے حد محبت تھی۔ مختار مسعود ہادی حسن کے دوسرے موضوعات کے ساتھ ان کی تقاریر پر زیادہ گفتگو کی ہے۔ ٹائن بی کا خاکہ بھی اس تصنیف میں شامل ہے۔ مختار مسعود نے ٹائن بی کا ذکر اس کی کتاب ”تاریخ کا ایک مطالعہ“ کے حوالے سے کیا ہے۔ دوسری شخصیات کی طرح ٹائن بی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے۔ ٹائن بھی کا تذکرہ انھوں نے کچھ یوں کیا ہے:

> ”میں نے جب سے اٹوگراف البم نکالی، ٹائن بی نے قلم کھولا، دستخط کیے۔ عیسوی تاریخ لکھی، سر اُٹھایا اور مسکرا کر کہا میں ہجری سن بھی لکھنا چاہتا ہوں۔“(۱۶)

آواز دوست میں ایک خاکہ علی گڑھ کے پرووائس چانسلر اے بی حلیم کا بھی ہے۔ اس خاکے میں مختار مسعود نے ان کی علی گڑھ کے لیے خدمات کا تفصیل کے ساتھ جائزہ پیش کیا ہے۔ اے بی حلیم کے بعد مصنف نے شاعر مشرق علامہ محمد اقبال اور قائد اعظم کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے علامہ اقبال پر بھرپور بحث کے ساتھ قائد اعظم کے جلسے جلوسوں اور اُن کے تقاریر کا جائزہ پیش کیا ہے۔ قائد اعظم کے دستخط حاصل کرنے کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ میں نے گھبرا کر اٹوگراف البم قائد اعظم کے سامنے رکھ دی وہ ابھی دوسری البم پر دستخط کر رہے تھے۔ ایک رعب دار آواز آئی wait! تھوڑی دیر بعد خود ہی میرے ہاتھ سے اٹوگراف البم لی اور دستخط کر دیے۔ اس بحث کے حوالے سے سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

”کتاب میں جن لوگوں کا تذکرہ آیا ہے وہ سب لوگ ان کے ہیرو نہیں ہیں۔ مجھے تو ان میں ایک شخصیت نظر آتی ہے۔ جس کی راہ میں دیدہ دل بچھاتے ہوئے انھوں نے اپنے پاس کچھ بچا کر نہیں رکھا، وہ ہے قائد اعظم کی شخصیت۔ مسلسل تذکرہ ان کا بھی چند صفحوں سے زائد نہ ہو گا مگر ان کی خوشبو پوری کتاب میں بسی ہوئی ہے۔“(17)

آوازِ دوست کے آخری حصے میں مختار مسعود نے اپنی نظر کے مطابق بڑے لوگوں کی صفات اور خوبیاں بیان کی ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے کار لائل، جارج، خالدہ ادیب خانم اور نطشے وغیرہ کے اقوال لکھے ہیں۔ اس آخری حصے میں مذکورہ شخصیات کے اقوال کی روشنی میں انھوں نے گویا یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاملِ کتاب خاکوں کے صاحب واقعی طور پر کمال اور خوبیوں سے مزین تھے۔ کتاب کے آخر میں وہ ایک دفعہ پھر ولندیزی بہادر بچے کی کہانی کی طرف آجاتے ہیں۔ اس قصے کا اختتام وہ بادشاہ کے خواب پر کرتے ہیں جس میں سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں۔

آخر میں مصنف اپنی آٹو گراف البم کی طرف آتے ہیں جس کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ یہ البم نصف بھر چکی ہے اور نصف خالی ہے۔ پہلے حصے کو وہ خوشحالی کے سات سال کی یادگار گردانتے ہیں جب کہ دوسرے حصے کو وہ خشک سالی کی نشانی سمجھتے ہیں۔ ان کے بقول پہلا حصہ جو قحط الرجال پر مبنی ہے اتنا طویل ہو گیا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ وہ کہتے ہیں کہ بادشاہ کے خواب کی تعبیر کے مطابق ایک دن زور کی بارش برسے گی اور خشک سالی ختم ہو جائے گی۔ میرے ایک ہاتھ میں چراغ ہے اور دوسرے میں میری آٹو گراف البم اور لب پر یہ شعر:

گفتند یافت می نشود جستہ ایم ما

گفت آنکہ یافت می نشود، آنم آرزوست

حوالہ جات

1۔ کرنل محمد خان، تاثرات، مشمولہ، صاحب آواز دوست، بک کارنر، جہلم، ص 203، 2017ء
2۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، فائن بکس پرنٹرز، لاہور، ص9، 1973ء
3۔ ایضاً، ص23
4۔ ایضاً، ص28
5۔ سید ضمیر جعفری، آوازِ دوست کی چند لہریں، مضمون، مشمولہ، صاحب آواز دوست، بک کارنر، جہلم، ص 07، 2017ء
6۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، فائن بکس پرنٹرز، لاہور، ص41، 1973ء
7۔ ایضاً، ص80
8۔ ایضاً، ص81
9۔ ایضاً، ص92
10۔ ایضاً، ص115

11۔ ایضاً، ص123

12۔ سید ضمیر جعفری، آوازِ دوست کی چند لہریں، مضمون، مشمولہ، صاحب آواز دوست، بک کارنر، جہلم، ص214، 2017ء

13۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، فائن بکس پرنٹرز، لاہور، ص۱۳۲، 1973ء

14۔ ایضاً، ص۱۳۲

15۔ ایضاً، ص۱۴۳

16۔ ایضاً، ص۱۵۳

17۔ سید ضمیر جعفری، آوازِ دوست کی چند لہریں، مضمون، مشمولہ، صاحب آواز دوست، بک کارنر، جہلم، ص211، 2017ء

18۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، فائن بکس پرنٹرز، لاہور، ص231، 1973ء